شیخ عبدالعزیز بن بازؒ

علم و تقویٰ کا حسین امتزاج

حافظ محمد ادریس

ماہ محرم کی ۲۶ تاریخ کو مشرق و مغرب کے ذرائع ابلاغ نے ایک نہایت اندوہ ناک خبر سنائی۔ اس خبر نے پورے عالم اسلام میں اداسی پھیلا دی۔ ۲۶ محرم ۱۴۲۰ھ' ۱۳ مئی ۱۹۹۹ء جمعرات کے دن دنیاے اسلام کے عظیم عالم دین اور سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ ابو عبداللہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں ریاض میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا الیہ راجعون!

شیخ بن باز کی ساتویں پشت میں ان کے جد امجد کا نام باز تھا۔ انھی کی وجہ سے یہ خاندان آل باز کہلاتا ہے اور شیخ عبدالعزیز ان کی نسبت سے شیخ بن باز معروف ہو گئے تھے۔ شیخ مرحوم پوری دنیا میں معروف اور عالم عرب میں مقبول عالم دین تھے۔ ان کی وفات سے علمی حلقوں میں بہت بڑا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پر ہونا بہت مشکل ہے۔ شیخ بن باز ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۱ء) میں ریاض میں ایک معمولی زراعت پیشہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۴۶ھ میں آشوب چشم کی بیماری میں مبتلا ہوئے۔ مقامی طبیبوں سے علاج کروایا مگر افاقہ نہ ہوا۔ ان کی آنکھیں خاصی خراب ہو گئیں۔ چار سال کا طویل عرصہ وہ اس تکلیف میں مبتلا رہے۔ اس کے بعد ۱۳۵۰ھ میں ان کی دونوں آنکھوں کی بینائی مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ یہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس سے یہ نوجوان عالم دین دوچار ہوئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اپنے اس فیصلے میں ایسی مصلحت اور حکمت پنہاں رکھی ہوئی تھی کہ آنکھوں کی بینائی زائل ہو جانے کے بعد اس نے ان پر اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی حصول علم اور اسے دوسرے لوگوں تک پہنچانے اور پھیلانے کے لیے وقف کر دی اور بلاشبہ اس کا حق ادا کیا۔ سعودی عرب جو آج کل طبی سہولتوں کے لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہوتا ہے' تیل کی دریافت سے قبل اور تیل کی دریافت کے بعد ابتدائی سالوں میں جدید طبی سہولتوں سے بالکل محروم تھا۔ شیخ کے علاوہ بھی ان کے ہم عصر بہت سے علما اور معروف سعودی شخصیات اسی نوعیت کی بیماری میں مبتلا ہو کر بینائی سے محروم ہو گئی تھیں۔

شیخ عبدالعزیز بن باز بلا کے ذہین اور غیر معمولی حافظے کے مالک تھے۔ اللہ نے انھیں ایسی صلاحیتیں عطا

کی تھیں کہ اگر انھیں نابغہ روزگار کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ ابتدائی عمر میں ہی انھوں نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ حصول علم کے لیے ریاض اور نجد کے دوسرے علاقوں میں علما کے پاس حاضر ہو کر اپنی پیاس بجھانے لگے تھے۔ شیخ نے حجاز مقدس میں مکہ اور مدینہ کے علما سے بھی اکتساب علم کیا۔ ان کے اساتذہ جید علماے دین تھے اور بن باز کے شوق علم کے مداح تھے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز نے تجوید سیکھنے کے لیے خصوصی طور پر مکہ مکرمہ کے معروف عالم دین اور قاری شیخ سعد بن وقاص بخاری سے ۱۳۵۵ھ میں کئی مہینوں تک تعلیم حاصل کی اور تجوید کے رموز و معارف سیکھے۔ مجھے شیخ سے تلاوت قرآن سننے کا شرف حاصل ہوا۔ شیخ کا لب و لہجہ نجدی تھا مگر ان کی تلاوت میں بہت درد اور سوز و گداز پایا جاتا تھا۔ بسااوقات یوں معلوم ہوتا تھا کہ تلاوت کرتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی ہے اور ان کا دل خشیت الٰہی سے لرز رہا ہے۔ یہ علماے ربانی کی خاص علامت ہے جو آج کے دور میں خال خال نظر آتی ہے۔

شیخ عبدالعزیز بن باز ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے ایک عام سے انسان نظر آتے تھے اور خاندانی لحاظ سے بھی وہ سعودی عرب کے کسی بڑے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس کے باوجود ان کے علمی مقام و مرتبے کا یہ عالم تھا کہ سعودی عرب میں شاہی خاندان اور آل شیخ کے بعد جس شخص کو سب سے زیادہ شہرت اور عزت کا مقام ملا وہ شیخ بن باز ہی تھے۔ تعلیم' سماجی و معاشرتی اصلاحات اور خدمات اسلامیہ کے میدان میں کوئی بڑا ادارہ ایسا نہیں تھا جس کی سربراہی شیخ بن باز کے حصے میں نہ آئی ہو۔ رابطہ عالم اسلامی سے لے کر دارالافتاء والارشاد تک اور عالمی مساجد کونسل سے لے کر مدینہ کی اسلامی یونی ورسٹی تک' کبار علما کی مجلس سے لے کر مفتی اعظم کے اعلیٰ عہدے تک' سبھی اداروں کے سربراہ کے مناصب پر وہ فائز رہے مگر ان کا عجز و انکسار اور تواضع کا معمول ہمیشہ قائم رہا۔

بعض معاملات میں وہ منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ جب سعودی عرب میں روپے کی ریل پیل شروع ہوئی اور اس کے ساتھ میڈیا میں تفریح کے نام پر عریانی اور فحاشی نے رنگ دکھانا شروع کیا تو شیخ نے اس پر احتجاج کیا۔ شاہی خاندان ہمہ مقتدر ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے علما کی آرا کو بعض معاملات میں وزن بھی دیتا ہے مگر ظاہر ہے کہ انتظامی اور حکومتی فیصلوں میں علما کی رائے ایک حد تک ہی قبول کی جاتی ہے۔ شیخ کی بات جب نہ مانی گئی تو شیخ نے احتجاج کیا اور اس کے اظہار کے لیے کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے گئے۔ یہ دور انھوں نے زیادہ تر کویت میں گزارا مگر شاہی خاندان کے ذمہ داران نے ان سے اپنے نمایندوں کے ذریعے رابطہ رکھا اور بات چیت کے ذریعے انھیں واپس وطن لے آئے۔ اس واقعے کا ذکر شیخ کے تذکرہ نگار عموماً اپنی تحریروں میں نہیں کرتے مگر یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہم واقعہ ہے۔ اپنے دور شباب میں شیخ نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ احتجاجی اقدام کیا مگر وہ ایک فرد واحد تھے اور وہ بھی آنکھوں سے معذور' کوئی طویل جدوجہد نہیں کر سکتے تھے۔ بالآخر انھوں نے حکومت کی کچھ یقین دہانی کے

بعد وطن واپس آنا اور مختلف مناصب پر کام کرنا قبول کر لیا۔ اس کے باوجود شیخ کے اس اقدام نے ان کی دھاک بٹھا دی جس کا بعد میں انھیں فائدہ بھی ہوا۔ وقتاً فوقتاً شیخ اپنے فتاویٰ میں میڈیا پر تنقید بھی کرتے رہے۔ ان کا نقطۂ نظر آخر میں یہ ہو گیا تھا کہ حکومت کے قریب رہ کر نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔ کسی حد تک یہ موقف بعض لوگوں کے نزدیک درست بھی ہے اس لیے کہ کوئی بھی انسان اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہاں اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اس کے پاس ذرائع اور قوت ہو۔ اپنی قوت سے زائد کا وہ مکلف نہیں ٹھیرایا گیا۔ تاہم جن ممالک اور معاشروں میں تنظیم سازی، جمہوری جدوجہد اور عوامی تحریک اٹھانے کے مواقع موجود ہوں ان کا موازنہ شخصی حکومتوں اور بادشاہتوں سے مناسب نہیں۔

شیخ عبدالعزیز بن باز اپنے فتاویٰ میں کھری بات کہا کرتے تھے۔ حنبلی المسلک ہونے کے باوجود چونکہ خود مجتہد تھے، قرآن و سنت پر ان کی بڑی گہری نظر تھی اور تمام مآخذ انھیں مستحضر تھے اس لیے اپنی رائے اور فتویٰ فقہی مسالک کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر دیتے تھے۔ کئی معاملات میں دیگر ائمہ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حنبلی فقہا کی رائے کے خلاف بھی انھوں نے فتوے دیے ہیں، جو ان کی فتاویٰ کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے فتاویٰ درجن بھر جلدوں میں مرتب ہو چکے ہیں اور بے شمار فتاویٰ ابھی ایسے ہیں جو کتابی صورت میں آنے باقی ہیں۔ ان فتاویٰ میں تکرار بھی ہے اور جدید مسائل اور سیاسی موضوعات کے بارے میں ان کی بعض آرا میں کچھ ضعف بھی ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ہمیشہ جو بات بھی کہی اس کو پورے یقین اور حزم کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

شیخ مرحوم، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی طرح بہت وسیع الظرف اور علمی میدان میں تحقیق اور مجتہدانہ کاوش کے قائل تھے اور اس اصول پر کاربند بھی کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوتا۔ البتہ ہر مدعی علم کا یہ منصب نہیں کہ وہ اجتہادی فیصلے صادر کرنا شروع کر دے۔ اجتہاد کے لیے سلف صالحین نے جو بنیادی اصول اور قابلیت کے ضابطے مقرر کیے تھے ان کی موجودگی ہی میں اجتہاد معتبر و مستند قرار پا سکتا ہے۔ شیخ بن بازؒ اور سید مودودیؒ دونوں بزرگ، اجتہاد کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کاوشوں کو شرف قبولیت بخشے۔

شیخ عبدالعزیز بن باز کی بہت ساری خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بہت مہمان نواز تھے۔ ان کے ہاں جو کوئی بھی چلا جاتا بلاتخصیص ان کے دستر خوان پر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتا تھا۔ ان کا دستر خوان وسیع بھی تھا اور سادہ بھی۔ جو کوئی ان سے ملاقات کے لیے چلا جاتا اس سے تعارف کے بعد شیخ اسے اپنے ہاں کھانے کی دعوت ضرور دیتے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز جب مکہ میں مقیم تھے تو انھوں نے اپنی اس رائے کے عین مطابق ذاتی طور پر عمل کر کے دکھایا کہ مکہ کے گھروں میں زائرین جب بھی آ جائیں اور جہاں بھی آ جائیں اور گنجایش موجود ہو تو انھیں بلامعاوضہ جگہ فراہم کرنی چاہیے۔ اس موضوع پر علما کے

درمیان بڑی بحثیں ہوئیں مگر شیخ بن باز نے اس میں کسی قسم کی مداہنت سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے محض فتویٰ دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے اس فتویٰ پر عمل کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ اپنی ہر بات میں مخلص اور اپنے قول و فعل میں مکمل مماثلت رکھنے والے عالم ربانی ہیں۔

شیخ عبدالعزیزؒ بن باز جن دنوں اسلامی یونی ورسٹی مدینہ میں وائس چانسلر تھے، مجھے ان کی خدمت میں دو مرتبہ حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس منصب سے ان کی فراغت کے بعد ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں اور ایک مرتبہ ریاض میں بھی ان کے ہاں حاضری کا اعزاز ملا۔ مدینہ منورہ میں، میں جب شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اسلامک فاؤنڈیشن نیروبی کے ڈائریکٹر اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نمایندے کی حیثیت سے ان سے ملاقات کی۔ شیخ اپنی روایتی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ بہت محبت کا اظہار کیا اور سید مودودیؒ کے بارے میں بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ افریقہ میں ہمارے دعوتی و تعلیمی کام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں بڑی دلچسپی لی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ افریقی ممالک میں شیخ کے جو مختلف شاگرد تعلیمی و تبلیغی خدمات سرانجام دے رہے تھے، ان کا حال احوال بھی پوچھتے رہے۔ مجھے اس بات پر خوش گوار حیرت ہوئی کہ شیخ کو اپنے شاگردوں کے نام تک یاد تھے۔

شیخ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں میں عرب دنیا کے علاوہ افریقہ، برعظیم پاک و ہند، مشرق بعید، یورپ اور چین تک کے باشندگان شامل تھے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، سلفی سبھی شیخ کو یکساں عزیز تھے۔ یہ ان کی عظمت کی دلیل تھی۔ شیخ کی مجلس میں ایک عجیب علمی اور روحانی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوتے تو بھی اس قدر فعال اور بیدار مغز کہ بہ یک وقت کئی معاملات کو نپٹا رہے ہوتے۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دو تین سیکرٹری ان کے پاس موجود ہوتے۔ ایک کو کسی ایک موضوع پر املا لکھوا رہے ہیں تو دوسرے کو کسی اور موضوع کے بارے میں ہدایات دے کر فارغ کر رہے ہیں۔ اسی دوران میں کوئی زائر آگیا ہے تو اس سے حال احوال بھی پوچھ رہے ہیں، اور اس کے سوالوں کے جواب بھی دے رہے ہیں۔ ٹیلی فون آگیا تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ شیخ اس وقت مصروف ہیں، بعد میں ٹیلی فون کرلیں، بلکہ اسی وقت شیخ سے بات کروائی گئی، اور شیخ نے سائل کو اس کے سوال کا سیر حاصل جواب دیا۔ کسی لمحے یہ احساس نہ ہوتا تھا کہ شیخ اکتا گئے ہیں یا بوریت محسوس کر رہے ہیں۔ ان کو اللہ نے بڑا حوصلہ اور ظرف عطا کیا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ اتنی مصروفیات کے باوجود وہ اتنا علمی ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے کہ آنکھوں والے بھی رشک کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شیخ کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ جو بات بھی کریں اور کسی بھی موضوع کے بارے میں کسی بھی سوال کا جواب دیں، تو اسے ریکارڈ میں آنا چاہیے۔ چنانچہ شیخ کی کم و بیش تمام باتیں تحریر یا کیسٹ کی صورت میں محفوظ ہوتی رہیں اور انھی چیزوں کو بعد میں مرتب کیا گیا۔ مجھے شیخ کے خطاب بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ وہ بہت پروقار علمی انداز میں گفتگو فرماتے تھے۔

شیخ عبدالعزیز بن باز عالم اسلام کے تمام معاملات پر نظر رکھتے تھے اور اخباروں کی خبریں' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تبصرے اور مختلف جانب سے آنے والی تازہ ترین (up date) معلومات اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے۔ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہونے کے بعد شیخ اکثر اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے کہ اے پروردگار' تو نے مجھے آنکھوں کی بصارت سے محروم کیا ہے تو مجھے بصیرت سے وافر حصہ عطا فرما اور تو نے دنیا میں مجھے ایک نعمت سے محروم کر دیا ہے تو آخرت میں مجھے اس کے بدلے میں اپنی رضا کی صورت میں اجر عطا فرما۔ شیخ کی یہ دونوں دعائیں مقبول نظر آتی ہیں۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی بصیرت عطا فرمائی کہ جس پر آنکھوں والے بھی رشک کرتے ہیں اور ان کا عمومی طرز عمل جس میں عجز و انکسار بھی تھا' للہیت اور تقویٰ بھی' خشیت خالق اور حب خلق بھی بدرجہ اتم موجود تھی' آخرت کی کامیابی کی ضمانت معلوم ہوتی ہے۔

شیخ' عالم اسلام کے مختلف معاملات میں نہ صرف دلچسپی لیتے تھے بلکہ ان پر اظہار خیال بھی کرتے تھے۔ دنیا میں مسلمانوں پر کہیں ظلم ہو رہا ہو' وہ فوراً اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے جو عرب دنیا میں بھرپور انداز میں اور مشرقی اور مغربی دنیا میں بھی کافی حد تک میڈیا کے ذریعے سے نشر ہو جاتا۔ حالیہ دور میں فلسطین کے مسئلے پر بعض عرب سربراہوں اور دانش وروں نے جو کمزور رویہ اختیار کیا اور غاصب صیہونیوں کے متعلق سابقہ سخت پالیسی میں نرمی آگئی تو خیال یہ تھا کہ شیخ اپنی روایت اور افتاد طبع کے مطابق اپنے سخت رویے کو ترک نہیں کریں گے۔ مگر شیخ نے بعض مصالح کے پیش نظر اس میں کچھ نرمی اختیار کی جس پر شیخ عبدالعزیز بن باز اور معروف دانش ور اور عالم دین شیخ یوسف القرضاوی کے درمیان اختلاف رائے ہوا اور یہ اختلاف رائے عربی اخبارات اور میڈیا کے ذریعے عام قارئین تک بھی پہنچا۔ مگر اس کے باوجود ان دونوں بزرگوں کا کمال ہے کہ باہمی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک دوسرے سے رابطہ اور نیک تمناؤں کا تبادلہ جاری رہا۔ اس کا ذکر شیخ یوسف القرضاوی نے کویت سے شائع ہونے والے عربی مجلے المجتمع میں اپنے تعزیتی مضمون میں بھی کیا ہے۔ علمائے ربانیین اور اہل حق کا یہ ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے کہ وہ اختلاف رائے کو بنیادی حق شمار کرتے ہیں اور اس پر تلخی اور عداوت کے جذبات پالنے کی بجائے رواداری اور علمی بردباری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان دونوں عظیم علما نے بھی اس امر کا بھرپور اہتمام کیا۔

سعودی عرب میں شاہی خاندان اور آل شیخ کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ان کی مراعات بے پناہ ہیں۔ ان کے علاوہ جو مشہور خاندان ہیں ان میں سدیری' آل رشید' بن لادن' بن محفوظ' باوزیر' شربتلی' جفالی' نصیف اور ولہ تمیلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شیخ کا ان میں سے کسی کے ساتھ بھی تعلق نہیں تھا مگر اپنی علمی وجاہت' تقویٰ اور اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت ان تمام خاندانوں کے افراد حتیٰ کہ شہزادگانؒ تک شیخ کے دروس میں نہایت عقیدت اور شوق سے شریک ہوتے دیکھے گئے۔ ذاتی معاملات میں یہ سب لوگ شیخ سے رہنمائی بھی حاصل کیا کرتے تھے۔ شیخ نے زندگی بھر دولت کی فراوانی کے باوجود پیسے کا لالچ نہیں کیا۔ انھوں

نے اپنی پوری زندگی مکمل قناعت کا نمونہ بن کر گزاری۔ اسی وجہ سے ان کو تمام حلقوں میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ایک عالم ربانی کی حیثیت سے شیخ کو جاننے والے سب لوگ یہ گواہی دیں گے کہ انھیں مادہ پرستی سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی کسی رائے سے کسی کو اختلاف بھی ہو تو اس بارے میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے کہ شیخ نے دنیا کی خاطر دین بیچنے کا راستہ کبھی اختیار نہیں کیا۔

سعودی عرب کے بیشتر لوگ روایتی جفاکشی ترک کر کے نہایت کم کوش، عشرت پسند اور سہل انگار ہو گئے ہیں، مگر شیخ نے بدویانہ طرز بود و باش، سادگی اور شبانہ روز محنت کو آخر دم تک اپنا شعار بنائے رکھا۔ ان کا لباس اس قدر سادہ ہوتا تھا کہ سلف صالحین کی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ شیخ عبدالعزیز بن باز نے طویل عمر پائی اور اس عمر کا ایک ایک لمحہ بہترین انداز میں گزارا۔ ان کے پاس وقت ضائع کرنے کے لیے قطعاً کوئی گنجایش نہ تھی۔ وہ جو وقت اپنے اہل و عیال کے ساتھ گزارتے وہ بھی عملاً تعلیم و تربیت ہی پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ شیخ نے اپنے پیچھے جو اولاد چھوڑی ہے ان کے مزاج میں بھی دینی رنگ غالب ہے اور شیخ کی قناعت کا کچھ حصہ ان کو بھی ملا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ شیخ عبدالعزیز بن باز کو ان کی نیکیوں پر بہترین اجر عطا فرمائے اور امت کو اس عظیم سانحے سے سنبھلنے کے لیے ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

حدیث شریف کے مطابق دنیا سے علم کے اٹھائے جانے کا طریقہ یہی ہے کہ علماے حق کو اٹھا لیا جائے۔ علم کے اٹھ جانے سے امت فقیر و مفلس ہو جاتی ہے۔ علمی افلاس اور قحط الرجال کے اس دور میں شیخ بن باز کا سانحہ ارتحال عظیم نقصان ہے۔ حق تعالیٰ امت پر رحم فرمائے اور مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقام رفیع بخشے۔